نظم قرآن: مولانا مودودیؒ اور مولانا فراہیؒ کے نظریات

مولانا نعیم الدین اصلاحی

سہ ماہی مجلّہ تحقیقات اسلامی علی گڑھ، جولائی - ستمبر ۲۰۰۸ء میں پروفیسر سید احتشام احمد ندوی کی ایک فاضلانہ تحریر نقد و استدراک کے کالم میں 'نظم قرآن اور شاہ ولی اللہؒ اور مولانا مودودیؒ کے نظریات' کے زیر عنوان شائع ہوئی ہے۔ اس میں موصوف نظم قرآن کے سلسلے میں مولانا مودودیؒ کے خیالات دیباچہ تفہیم القرآن سے ایک طویل اقتباس کی شکل میں نقل کر کے فرماتے ہیں: ''مولانا مودودیؒ نے جو عالمانہ افکار پیش کیے ہیں اور قرآن مجید کی تقریری زبان اور اسلوب کو جس طرح پیش کیا ہے وہ مولانا فراہیؒ کے نظم قرآن سے بالکل مختلف ہے، بلکہ اس سے ایک طرح سے اس کی تردید ہوتی ہے'' (ص ۱۰۳)۔ اس تحریر میں تھوڑی تشنگی محسوس ہو رہی ہے۔ اگر موصوف اس کی مثالیں دے کر وضاحت فرماتے تو شاید زیادہ مناسب ہوتا اور نظم قرآن کے سلسلے میں مولانا مودودیؒ کے افکار کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے واضح رہنمائی ملتی۔

اس میں شک نہیں کہ مولانا مودودیؒ کا میدانِ فضل و کمال دین بحیثیتِ نظامِ زندگی ہے اور مولانا فراہیؒ کی تحقیق و جستجو کا طرّہ ٔ امتیاز قرآنی علوم اور اس کا فلسفہ ٔ نظام و حکمت ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اگر قرآن کا وسیع نظم دریافت کیا تو مولانا مودودیؒ نے اسلامی نظام کو محکم دلائل و براہین کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس نظام کو قائم کرنے کے لیے ایک منظّم تحریک برپا کی اور تادم مرگ اسی راہ پر گامزن رہے۔ تاہم ان کی تفسیر 'تفہیم القرآن' نظم قرآن کی حکمتوں سے یکسر خالی نہیں ہے۔ سرسری طور پر تفہیم القرآن جلد اول سے نمونہ کے طور پر چند مثالیں پیش خدمت ہیں، جن سے یہ بات واضح طور سے جھلک رہی ہے کہ مولانا مودودیؒ نے حتی الامکان تفسیر قرآن میں نظم کو ملحوظ

رکھا ہے۔

۱- سورۂ البقرہ آیت ٦ کا ربط مولانا مودودیؒ نے دو طرح سے واضح کیا ہے۔ اولاً اس کے لیے انھوں نے قوسین کا استعمال کیا اور ان کا یہ خاص وصف ہے کہ جا بجا انھوں نے قوسین کے ذریعہ نظم کلام کو واضح کیا ہے۔ چنانچہ مذکورہ آیت کا ترجمہ انھوں نے قوسین کے ساتھ یوں کیا ہے: 'جن لوگوں نے (ان باتوں کو تسلیم کرنے سے) انکار کر دیا''۔ ثانیاً اس ربط کو مزید اپنے حاشیے کے ذریعہ روشن کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں: ''یعنی وہ چھ٦ شرطیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے پوری نہ کیں اور ان سب کو یا ان میں سے کسی ایک کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا'' (تفہیم القرآن، جلد اول، ص۵۲، ح۹)

۲- سورۂ البقرہ آیت ۲۱ کا سیاق وہ اس طرح واضح کرتے ہیں:

''اگرچہ قرآن کی دعوت تمام انسانوں کے لیے عام ہے، مگر اس دعوت سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا لوگوں کی اپنی آمادگی اور اس آمادگی کے مطابق اللہ کی توفیق پر منحصر ہے۔ لہٰذا پہلے انسانوں کے درمیان فرق کر کے واضح کر دیا گیا کہ کس قسم کے لوگ اس کتاب کی راہ نمائی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور کس قسم کے لوگ نہیں اٹھا سکتے ہیں، اس کے بعد تمام نوع انسانی کے سامنے وہ اصل بات پیش کی جاتی ہے جس کی طرف بلانے کے لیے قرآن آیا ہے''۔ (ص۵۷، ح۲۱)

۳- سورۂ البقرہ آیت ۳۰ کا ربط ملاحظہ فرمائیں:

''اوپر کے رکوع میں بندگیٔ رب کی دعوت اس بنیاد پر دی گئی تھی کہ وہ تمہارا خالق ہے، پروردگار ہے، اس کے قبضۂ قدرت میں تمہاری زندگی و موت ہے اور جس کائنات میں تم رہتے ہو اس کا مالک و مدبّر وہی ہے، لہٰذا اس کی بندگی کے سوا تمہارے لیے اور کوئی دوسرا طریقہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ اب اس رکوع میں وہی دعوت اس بنیاد پر دی جا رہی ہے کہ اس دنیا میں تم کو خدا نے اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے تمہارا فرض صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اس کی بندگی کرو، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس بھیجی ہوئی ہدایت کے مطابق کام کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا اور اپنے ازلی دشمن شیطان کے اشاروں پر چلے تو

بدترین بغاوت کے مجرم ہوگے اور بدترین انجام دیکھو گے۔ (ص ۶۱، ح ۳۶)

۴- سورۂ البقرہ آیت ۴۰ کا ربط اس طرح واضح کرتے ہیں:

''پچھلے چار رکوعوں میں تمہیدی تقریر تھی، جس کا خطاب تمام انسانوں کی طرف عام تھا۔ اب یہاں سے چودھویں رکوع تک مسلسل ایک تقریر اس قوم کو خطاب کرتے ہوئے چلتی ہے جس میں کہیں کہیں عیسائیوں اور مشرکین عرب کی طرف بھی کلام پھیرا گیا ہے اور موقع موقع سے ان لوگوں کو بھی خطاب کیا گیا ہے جو آپ ﷺ کی دعوت پر ایمان لائے تھے''۔ (ص ۷۰)

۵- سورۂ البقرہ آیت ۲۳۸ کا ربط واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''قوانینِ تمدن و معاشرت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اس تقریر کو نماز کی تاکید پر ختم فرماتا ہے، کیونکہ نماز ہی وہ چیز ہے جو انسان کے اندر خدا کا خوف نیکی و پاکیزگی کے جذبات اور احکام الٰہی کی اطاعت کا مادہ پیدا کرتی ہے اور اسے راستی پر قائم رکھتی ہے۔ یہ چیز نہ ہو تو انسان کبھی الٰہی قوانین کی پابندی پر ثابت قدم نہیں رہ سکتا اور آخر کار اسی نافرمانی کی رَو میں بہ نکلتا ہے جس پر یہودی بہ نکلے''۔ (ص ۱۸۲، ح ۲۶۲)

۶- سورۂ البقرہ آیت ۲۵۸ کا ربط یوں واضح کرتے ہیں:

''اوپر دعویٰ کیا گیا تھا کہ مومن کا حامی و مددگار اللہ ہوتا ہے اور اسے تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور کافر کے مددگار طاغوت ہوتے ہیں اور وہ اسے روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ اب اسی کی توضیح کے لیے تین واقعات مثال کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان میں سے پہلی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جس کے سامنے واضح دلائل کے ساتھ حقیقت پیش کی گئی اور وہ اس کے سامنے لاجواب بھی ہوگیا، مگر چوں کہ اس نے طاغوت کے ہاتھ میں اپنی نکیل دے رکھی تھی، اس لیے وضوحِ حق کے بعد بھی وہ روشنی میں نہ آیا اور تاریکیوں ہی میں بھٹکتا رہ گیا۔ بعد کی دو مثالیں دو ایسے اشخاص کی ہیں جنھوں نے اللہ کا سہارا پکڑا تھا، سو اللہ ان کو تاریکیوں سے اس طرح روشنی میں نکال لایا کہ پردۂ غیب میں چھپی ہوئی حقیقتوں تک کا ان کو عینی مشاہدہ کرادیا''۔

(ص ۱۹۷-۱۹۸، ح ۲۸۹)

یہ صرف چند شواہد ہیں جو سرسری طور پر تفہیم القرآن جلد اول کی بالکل ابتداء سے لیے گئے ہیں۔ اگر تلاش کیا جائے تو اس میں مزید سیکڑوں شواہد ایسے مل سکتے ہیں جن میں مولانا مودودیؒ نے سیاق وسباق اور نظم کلام کی پوری رعایت ملحوظ رکھی ہے۔

فاضل مبصر نے مولانا مودودیؒ کا یہ بیان نقل کیا ہے: ''قرآن کا طرز بیان تحریری نہیں، تقریری ہے''۔ آگے مولانا مودودیؒ نے تقریر اور تحریر میں بہت سے فرق بیان کیے ہیں۔ مثلاً لکھا ہے:

''تحریر میں بیان کا تعلق ماحول سے جوڑنے کے لیے الفاظ سے کام لینا پڑتا ہے، لیکن تقریر میں ماحول خود ہی بیان سے اپنا تعلق جوڑ لیتا ہے اور ماحول کی طرف اشارہ کیے بغیر جو باتیں کہی جاتی ہیں ان کے درمیان کوئی خلا محسوس نہیں ہوتا۔ تقریر میں متکلم اور مخاطب بار بار بدلتے ہیں، مقرر اپنے زور کلام میں موقع ومحل کے لحاظ سے کبھی ایک ہی گروہ کا ذکر بصیغۂ غائب کرتا ہے اور کبھی اسے حاضر سمجھ کر براہ راست خطاب کرتا ہے، کبھی واحد کا صیغہ بولتا ہے اور کبھی جمع کے صیغے استعمال کرنے لگتا ہے، کبھی متکلم وہ خود ہوتا ہے کبھی کسی گروہ کی طرف سے بولتا ہے، کبھی کسی بالائی طاقت کی نمائندگی کرنے لگتا ہے اور کبھی وہ بالائی طاقت خود اس کی زبان سے بولنے لگتی ہے، تقریر میں یہ چیز ایک حسن پیدا کرتی ہے مگر تحریر میں آ کر یہی چیز بے جوڑ ہو جاتی ہے''۔

اس اقتباس سے مبصر موصوف یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ''مولانا مودودیؒ نے جو عالمانہ افکار پیش کیے ہیں اور قرآن مجید کی تقریری زبان اور اسلوب کو جس طرح پیش کیا ہے وہ مولانا فراہیؒ کے نظم قرآن سے مختلف ہے، بلکہ اس سے ایک طرح سے اس کی تردید ہوتی ہے''۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے مولانا فراہیؒ کے خیال کی تردید نہیں، بلکہ تائید ہوتی ہے۔ یہاں شارحِ فکر فرہیؒ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا ایک اقتباس نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

'' اس سلسلے کی تیسری مشکل تعیین خطاب کی مشکل ہے۔ قرآن مجید پر تدبر

کرنے والا جس چیز سے سب سے زیادہ الجھن محسوس کرتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے، بلکہ بسا اوقات ایک ہی آیت کے اندر خطاب بدلتا رہتا ہے۔ ابھی خطاب مسلمانوں سے تھا، ابھی مشرکین سے ہوگیا۔ ابھی ذکر اہل کتاب کا چل رہا تھا کہ دفعۃً مسلمان مخاطب ہوگئے۔ ابھی خطاب واحد کے صیغہ سے تھا، فوراً جمع کے صیغہ میں ہوگیا۔ اسی طرح خود مصدر خطاب بھی بدلتا رہتا ہے۔ ابھی خطاب براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا کہ دفعۃً رسولؐ کی طرف سے ہوگیا، ابھی رسول اللہ کی زبان سے کوئی بات کہی جارہی تھی کہ دفعۃً کوئی بات جبرئیل کی زبان سے تراوش ہوئی۔ مخاطب اور متکلم کی یہ تبدیلیاں ایک نومشق آدمی کو بہت پریشان کرتی ہیں اور اس قدر تیزی کے ساتھ جو تبدیلیاں واقع ہوں ان کے ساتھ سررشتہ نظم کو سنبھالنا بڑا مشکل ہے۔ تبدیلیٔ خطاب کی بہت کچھ الجھنیں تو اس بات کے سمجھ لینے سے دور ہوجاتی ہیں کہ قرآن مجید بہت بڑی حد تک خطبائے عرب سے مشابہت رکھتا ہے۔ جس طرح ایک خطیب محض اپنے رخ کی تبدیلی یا گردشِ چشم وابرو، بلکہ بسا اوقات لب ولہجہ کے تغیر اور معمولی التفات ہی سے اپنے مخاطب کو اثناء کلام کے اندر بدلتا رہتا ہے اسی طرح قرآن مجید میں بھی خطاب کی تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں اور اگر قاری کلام کے پس منظر پر نظر رکھتا ہو تو اس کو انتشارِ خطاب سے کوئی الجھن پیش نہیں آتی، بلکہ وہ کلام کی روانی کے ساتھ ساتھ بے تکلف مخاطب کو معین کرتا چلا جاتا ہے''۔ (مبادی تدبر قرآن، ص ۱۸۷-۱۸۸)

اس موضوع پر مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب 'اسالیب القرآن' میں التفات کے عنوان سے بہت اچھی بحث کی ہے۔ (ملاحظہ ہو اسالیب القرآن، مطبوعہ دائرہ حمیدیہ سرائے میر، ۱۳۸۵ھ، ص ۱۹)۔ اسی طرح انھوں نے مقدمۂ تفسیر نظام القرآن (پندرہواں مقدمہ) میں 'تعیینِ خطاب' کے موضوع پر بڑے قیمتی نکات پیش فرمائے ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے اس بحث کا خلاصہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

''مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ پورا قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، یعنی اس کو اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ پر اتارا۔ لیکن اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ پورے قرآن میں تمام خطاب

بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، مثلاً ''اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ'' (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) میں ظاہر ہے کہ خطاب بندے کی طرف سے ہے۔ علماء اس مضمون کو یوں تعبیر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سورہ بندوں کو تعلیم فرمائی ہے کہ یوں کہو، لیکن یہاں 'کہو' کا لفظ موجود نہیں ہے تو اس مقدر کو کس طرح مانا جائے؟ اسی طرح کا سوال مخاطب کے بارے میں پیدا ہوتا ہے کہ خطاب کس سے ہے؟ ہر خطاب میں دو پہلو ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ یہ خطاب کس کی طرف سے ہے؟ دوسرا یہ کہ خطاب کس سے ہے؟ اور ان دونوں کا حال یہ ہے کہ یہ عام ہوتے ہیں، لیکن مراد خاص ہوتی ہے اور کبھی خاص ہوتے ہیں اور مراد عام ہوتی ہے۔ چونکہ اس تبدیلی اور اس عموم و خصوص کے سبب سے معانی میں بڑی اہم تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ان کی تعیین کے لیے ایسے اصول دریافت کیے جائیں جو مشکلات میں رہ نمائی کر سکیں۔

خطاب میں ایک مصدر ہوتا ہے اور ایک منتہٰی۔ مصدر میں یا تو اللہ تعالیٰ ہو گا یا جبرئیلؑ یا رسولؐ یا لوگ۔ اسی طرح منتہٰی یا تو اللہ تعالیٰ ہو گا یا رسولؐ یا لوگ۔ لوگوں میں سب سے پہلے (سرفہرست) مسلمان ہوں گے یا منافقین یا اہل کتاب یا ذریتِ اسمٰعیل یا ان میں سے دونوں یا سب۔ اہل کتاب میں سے یا تو یہود ہوں گے یا نصاریٰ یا دونوں۔ یہ تو بالکل ظاہر پہلو ہوئے۔ اب ان التباس و اختلاط کی صورتوں پر غور کیجیے۔ مصدر میں التباس اللہ تعالیٰ، رسولؐ اور جبرئیلؑ کے مابین ہوتا ہے۔ اگر کوئی پورے تنبّہ کے ساتھ قرآن پڑھتا چلا جائے تو اس کو امتیاز کرنا مشکل ہو گا کہ کون قائل ہے؟ منتہٰی میں التباس نبیؐ اور مومنین کے مابین ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خطاب آپؐ سے ہے، حالاں کہ روئے سخن امت کی طرف ہوتا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم چوں کہ امت کے وکیل ہونے کی حیثیت سے ان کی زبان اور ان کے کان ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے مخاطب آپ کو کیا جاتا ہے۔ توریت میں بھی اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ خطاب بظاہر صیغۂ واحد سے حضرت موسیٰؑ کی طرف ہے، لیکن مراد ان کی امت ہے۔ قرآن مجید میں اس طرح کے جو مواقع ہیں وہاں نظم اور سیاق و سباق کلام کی رہ نمائی سے معلوم ہو جاتا ہے

کہ مخاطب کون ہے؟ سورۂ توبہ میں ایک آیت ''إِن تُصِبْکَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْکَ مُصِیبَةٌ یَقُولُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِن قَبْلُ'' (اگر تم کو کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان کو تکلیف پہونچتی ہے اور اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں خوب ہوا ہم نے اپنا بچاؤ پہلے ہی کر لیا) یہاں خطاب واحد کا ہے، لیکن مراد اس سے عام مومنین ہیں۔ چنانچہ اس کے جواب میں اس کی وضاحت ہوگئی فرمایا: ''قُل لَّن یُصِیبَنَا إِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُونَ'' (کہہ دو کہ نہیں پہنچے گی ہم کو کوئی مصیبت، مگر اللہ نے جو ہمارے لیے لکھ دی ہے۔ وہ ہمارا مولیٰ ہے اور چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں اہل ایمان) اسی طرح سورۂ بنی اسرائیل میں مخاطب بہ ظاہر پیغمبر کو کیا گیا ہے، لیکن خطاب دراصل امت کی طرف ہے۔ فرمایا ''إِمَّا یَبْلُغَنَّ عِندَکَ الْکِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ کِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا کَرِیمًا'' (اور اگر تمہارے سامنے ان (والدین) میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچیں تو ان کو اف تک نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے ادب کی بات کہو)۔ اس طرح کی متعدد مثالیں ہیں جو ہیں تو بظاہر خاص، لیکن مراد ان سے عام ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور مولانا فراہیؒ کے ان اقتباسات کی روشنی میں یہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ مولانا مودودیؒ اور مولانا فراہیؒ کے درمیان نظم قرآن کے باب میں کوئی بنیادی اور جوہری فرق نہیں ہے۔ مولانا مودودی کی کاوشوں اور سرگرمیوں کا مرکز نظام اسلام اور اس کا نفاذ رہا ہے، اس لیے انھوں نے نظم قرآن کو ایک خاص دائرے سے آگے نہیں بڑھایا ہے اور مولانا فراہی کی طرح زیادہ تفصیل کی انھوں نے ضرورت نہیں محسوس کی۔ ان کا یہ طریقہ ان کے خاص مشن اور نصب العین کے لحاظ سے نہایت معقول اور مستحسن ہی کہا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆